پروفیسر عارفہ بشریٰ

# اردو ناول کی دیو مالائی جڑیں

کہانی کہنا اور سننا مشرقی تہذیب کا خاصہ رہا ہے۔"آپ بیتی" یا" جگ بیتی" کے بیان کا آغاز وارتقاء مشرق میں کس انداز میں ہوا اس کا تفصیلی جائزہ دراصل ناول کی شعریات کا ہی جائزہ ہے خواہ یہ جائزہ کلاسیکیت کے حوالے سے لیا جائے یا ترقی پسند نقطۂ نظر سے یا پھر جدیدیت کے رجحان کی بنیاد پر لیا جائے۔ ہر حال میں ناول کی ہیئت کی مختلف صورتیں ہی سامنے آئیں گی۔

دراصل مشرق کہانیوں کی سرزمین ہے۔اسی لیے عزیز احمد اور کئی دوسرے دانشوروں نے کہا ہے کہ کہانی کا فن مغرب سے مشرق میں نہیں بلکہ مشرق سے مغرب میں گیا۔لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ نئی قدروں' ثقافتوں اور ہیئتوں کے ساتھ کہانی مختلف نئی شکلوں میں مغرب سے مشرق میں آئی۔اردو میں مختصر افسانہ (Short Story) اور ناول اپنے موجودہ ہیئتی' فنی اور تخلیقی تقاضوں کے ساتھ مغربی مختصر افسانہ اور ناول کے اثر سے ہی آگے بڑھ رہے ہیں۔اسی لیے انیسویں صدی میں منشی کریم الدین (خط تقدیر) ڈپٹی نذیر احمد (مراۃ العروس) مرزا ہادی رسوا (امراؤ جان ادا) اور پریم چند (اسرار معابد) کے ہاتھوں اردو میں ناول نگاری کی ابتداء سے لے کر آج غضنفر' پیغام آفاقی' مشرف عالم ذوقی

اور ترنم ریاض کے ناولوں تک اردو ناول موضوع اسلوب' ہیئت اور تکنیک وغیرہ کے حوالے سے مغربی ناول کے شانہ بشانہ ارتقائی مراحل طے کر رہا ہے۔ اس دوران سرسید تحریک' ترقی پسند تحریک' جدیدیت اور دیگر نظریات و تصورات جس طرح اردو کی دوسری اصناف پر اثر انداز ہوئے اسی طرح اردو ناول بھی ان سے اثر قبول کرتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے ہی مغربی ادب میں نئے نظریات اور تصورات کے زیر اثر افسانوی ادب میں بھی نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں اور اسلوب بیان بیانیہ' موضوع' کردار اور حقائق و مسائل کے بیان کے ساتھ ساتھ ادبی اصناف کی روایتی صنفی حد بندیوں کو توڑنے اور بدلنے کے رجحانات بھی عام ہوئے۔ چنانچہ فردیت (Individualism) وجودیت (Existentialism) علامت نگاری (Symbolism) تجریدیت نو تاریخیت (Neo-Historicity) جیسے فلسفیانہ تصورات نے معاشرے کو ہی نہیں ادب و ثقافت کو بھی متاثر کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۰ء تک آ کر احب حسن (Ihab Hassan) اور لیزلی فیڈلر وغیرہ نے فکشن خاص طور پر ناول سے متعلق نئے تصورات پیش کئے اور یہ دعویٰ کیا کہ ناول کی صنفی حدود ٹھوس نہ رہ کر سیال ہو چکے ہیں اور اب ناول کی صنفی حدیں تاریخ اور فلسفہ کی حدوں کو چھونے لگی ہیں۔ ان تمام فلسفیانہ تصورات کا مغرب کے فکشن پر اثر پڑا اور مغرب میں Gabriel Garcia Marquez نے One Hundred Years of Soulitude (تنہائی کے سو سال) جیسا ناول لکھ کر ناول نگاری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اس کے ساتھ ہی کچھ اور لوگوں نے بھی انہی خطوط پر ناول لکھے۔

1- The French Lievtenant's Women

2- Famous lost Women

3- Ragtime Legs

اردو ادب مغربی زبانوں کے ادب سے اثرات قبول کرتا رہا ہے۔ چنانچہ ناول کے سلسلے میں بھی ایسا ہی ہوا خاص طور پر ۱۹۶۰ء کے آس پاس تک آکر جب جدیدیت کے رجحان کا عروج ہوا تو سب سے زیادہ اثر اردو فکشن پر ہی پڑا کیونکہ مابعد جدیدیت کے تصورات کو سب سے زیادہ فکشن میں ہی برتا گیا تھا۔ لہٰذا بیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں پیغام آفاقی' اقبال مجید' عبداللہ حسین' انتظار حسین' الیاس احمد گدی' عبدالصمد' حسین الحق' مشرف عالم ذوقی' شموئل احمد' غضنفر' ترنم ریاض اور سید محمد اشرف اور پیغام آفاقی وغیرہ کے جو ناول سامنے آئے وہ ناول سابقہ ناولوں کے فنی' لسانی' موضوعاتی اور تخلیقی رویوں کے اعتبار سے مختلف ثابت ہوئے اور پھر ۱۹۸۰ء کے بعد سے اردو میں ناول نگاری کی رفتار میں بھی تیزی آئی اور ناول نگاروں نے کہیں حقیقت نگاری اور کہیں علامت نگاری کے اثر سے ایسے ناول لکھے جن کی وجہ سے ناول نہ تو روایتی طور پر محض زندگی کی تصویر' معاشرے کا آئینہ اور حقائق کا ترجمان رہا بلکہ ناول وہ فن قرار پایا جس میں زندگی کے مقابلے میں خود ایک نئی زندگی کو جیتے جاگتے فطری اسلوب اور زندہ زبان میں پیش کیا گیا ہو۔ ''دو گز زمین''، ''فائر ایریا''، ''دویہ بانی''، ''بیان''، ''فرات''، ''ندی''، ''پروفیسر ایس کی عجیب داستان'' اور ''پلیتہ'' وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ اس طرح ۱۹۸۰ء سے قبل تک اردو ناول کا جو منظر نامہ سامنے آیا تھا وہ ۱۹۸۰ء کے بعد زیادہ سے زیادہ تہہ دار وسیع اور امکانات سے پُر ہوتا جا رہا ہے۔ ان ساری فنی' موضوعاتی' لسانی اور جمالیاتی تبدیلیوں کے باوجود چونکہ اردو ناول کی جڑیں بھی مشرقی زمین معاشرہ اور ثقافت میں پیوست ہیں اس لیے ہر دور میں اردو ناولوں میں دیومالائی عناصر کو کسی نہ کسی تناسب اور انداز میں برتنے کی روایت بہر حال برقرار رہی ہے۔ دیومالا چونکہ تاریخ' تہذیب اور زبان' ڈسکورس سے تعلق رکھتی ہے اس لیے ناول ان سب کے حوالے سے قدیم اور جدید دیومالاؤں کو نظر انداز کر بھی نہیں سکتا تھا یوں بھی اردو میں قصہ گوئی کی روایات داستانوں اور تمثیلی دیومالائی قصوں سے ہی فروغ

باقی رہی ہیں۔ یہ کہانیاں اردو زبان کی ترویج وتہذیب کا پتہ دیتی ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ملاوجہی کی تخلیق ''سب رس'' (۱۰۴۵ء) کو پہلی ادبی نثری داستان کی حیثیت حاصل ہے۔ انیسویں صدی کا نصف اول فن داستان نگاری کے عروج کا زمانہ ہے۔ میر امن کی ''باغ و بہار'' اردو فکشن کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس میں زندہ نثر اور قصہ نگاری کا شعور ملتا ہے لیکن کہانی کی جدید روش کے آثار مفقود ہیں۔ رجب علی بیگ سرور کی تصنیف ''فسانۂ عجائب'' میں لکھنؤ کے مختلف طبقوں کے حالات کی آئینہ داری کے باوجود زندگی کے معاملات و مسائل کا شعور نہیں ملتا۔ ان داستانوں میں دیو مالائی فضا اور مافوق الفطری عناصر پائے جاتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ناکامیابی نے داستانوں کے اس طلسم آفریں ماحول پر بھی ضرب کاری لگائی اور سیاسی وسماجی زندگی بھی ہر سطح پر انقلاب سے دوچار ہونے لگی۔ واہموں اور خواب و خیال کی وادیوں میں زندگی گذارنے کے چلن سے اجتناب کا میلان نمایاں ہوا۔ منجمد فضا متحرک ہونے لگی' نئے نئے مسائل سامنے آنے لگے اور ان کی تکمیل کی جستجو کی جانے لگی۔ عوامی معاشرے کی اصلاح کے لیے متعدد تحریکیں پیدا ہوئیں۔ ادبی سطح پر بھی ان اصلاحی تحریکوں نے دنیائے شعر و ادب کا رخ اختیار کیا تو فرسودہ روایتوں اور ادبی عقیدوں کی بنیادیں متزلزل ہوگئیں۔ واقعیت پسندی اور حقیقت نگاری کا شعور پروان چڑھنے لگا۔ نئے ادبی میلانات و رجحانات کی طرف لوگ متوجہ ہوئے اور ادب زندگی کے معاملات و مسائل سے آہستہ آہستہ قریب آنے لگا۔ سرسید اور ان کے رفقائے کار نے شعر وادب کے مختلف اسالیب میں فکر وفن کے وہ گل بوٹے کھلائے جن کے حسن واثر سے ہمارا ادبی شعور پہلی مرتبہ آشنا ہوا۔ سوچنے کا انداز بدل گیا' گفتگو کا سلیقہ تبدیل ہوگیا' محسوس کرنے اور محسوسات کو پیش کرنے کا ڈھنگ بدل گیا۔ اخلاقی قدروں کے معیار میں تبدیلی آگئی' آداب زندگی میں انقلاب برپا ہوا' حقائق واہموں پر حاوی ہونے لگے' بقول پروفیسر محمود الٰہی قصہ نگاری کے

شعور کا آخری تمثیلی نمونہ ''خط تقدیر'' ۱۸۶۲ء میں منظر عام پر آیا۔ ''خط تقدیر'' پر دیو مالا کا آب ورنگ حاوی ہے لیکن مستقبل قریب میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ کریم الدین داستانوں کے ساتھ ساتھ دیو مالائی فضا میں ''مضامین حقیقہ'' کی جستجو کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ انہوں نے روایتی قصوں کی مخالفت میں پہلی مرتبہ آواز اٹھائی۔ یہ بھی درست ہے کہ انہوں نے روایتی قصے کے ذہنی افق کو وسیع کیا' اس کی موضوعاتی سطح کو رفعت و کشادگی عطا کی اور اسے فکر کی گرمی بخشی لیکن ان کی قصہ نگاری اسلوب کے اعتبار سے روایتی ڈگر پر ہی چلتی رہی' قصے کا کوئی نیا طرز و ہا یجاد نہ کر سکے۔ زبان کے اصلاحی پہلو پر بھی انہوں نے شعوری طور پر توجہ کی لیکن اس کے باوجود ان کی زبان پھیکی اور بے کشش معلوم ہوتی ہے۔ اسلوب دیو مالائی و تمثیلی اور ساخت بیانیہ اور داستانوی ہے۔

## ☆۔ ڈپٹی نذیر احمد:

ڈپٹی نذیر احمد پہلے شخص ہیں جنہوں نے قصہ نگاری کے شعور کو جدید روش سے آشنا کیا۔ ان کے قصوں نے داستانوں کے غیر فطری ماحول' فوق البشر کردار اور محیر العقول واقعات کی جگہ دنیائے آب وگل کے معاملات و مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ ان کی سب سے پہلی تصنیف ''مراۃ العروس'' ۱۸۶۹ء میں شائع ہوئی اور یہی اردو میں صنف ناول کے آغاز کا پہلا زینہ ٹھہرتی ہے۔ یہ درست ہے کہ ''مراۃ العروس'' کی تصنیف کا مقصد اپنی بیٹیوں کی تعلیم و تربیت تھا لیکن یہ بھی ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اس کی غیر معمولی پذیرائی نے ڈپٹی نذیر احمد کو اس نوعیت کے دوسرے قصے لکھنے پر آمادہ کیا۔ چنانچہ ''بنات النعش'' ۱۸۷۲ء میں'' توبتہ النصوح'' ۱۸۷۴ء میں'''' فسانہ مبتلا'' المعروف ''محصنات'' ۱۸۸۵ء میں ''ابن الوقت'' ۱۸۸۸ء میں ''ایامیٰ'' ۱۸۹۱ء میں اور ''رویائے صادقہ'' ۱۸۹۴ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آئے۔ بعض فنی

خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود یہ کہانیاں ناول کے زمرے میں آتی ہیں اور زمانی پس منظر میں اہم تصانیف ہیں ڈاکٹر یوسف سرمست کے الفاظ میں:

> ''کوئی ایک ناول بھی ایسا نہیں جس میں انیسویں صدی کی سماجی زندگی اور اس زمانے کے مسلمان گھرانوں کی حقیقت شعارانہ عکاسی نہیں کی گئی ہو۔ انہوں نے زندگی کے حقائق اور اس کے ٹھوس پہلوؤں کو ہمیشہ سامنے رکھا کیونکہ ان کا مقصد انسان اور انسانی سماج کو بہتر بنانا تھا۔ یہ مقصدیت جب کہ خلوص پر مبنی ہو اور ناول نگاری کا محرک اصلی یہی ہو تو ناول کے فن کو زیادہ مجروح نہیں کرتی''۔[1]

ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے دور کے حالات کی تبدیلیوں کو محسوس کیا۔ ان کی ذاتی زندگی نے صورت حال کی سختیوں اور نرمیوں سے زندگی کا سلیقہ سیکھا تھا اور اس کا بھی فطری اثر ان کے نقطۂ نظر پر ہوا۔ چنانچہ اپنے ناولوں سے انہوں نے وہی کام انجام دیئے جو سرسید کی اصلاحی تحریک کا مقصد تھا۔ بے جان اخلاقی روایات اور فرسودہ رسوم وعقائد کے خلاف ڈپٹی نذیر احمد نے ایک فضا تیار کی۔ قصوں میں معاشرتی معاملات ومسائل کو پیش کر کے انہوں نے عصری تقاضوں سے متعلق اپنی شعوری بیداری کا ثبوت فراہم کیا۔ لیکن نذیر احمد بھی اسلامی اور ہندوستانی دیومالائی اثرات سے منہ نہیں موڑ سکے۔ نذیر احمد کے مثالی کرداروں اور اصلاحی واقعات میں عقیدہ، اخلاقی و مذہبی اقدار کے حوالے سے دیومالائی عناصر سر ابھارتے نظر آتے ہیں۔ ان کے مذکورہ بالا ناولوں میں ان کے اصلاحی مقاصد کا رنگ گہرا ہے۔ اگر چہ ان کے کرداروں کا تعلق ارضی زندگی سے ہے اس کے باوجود ان کے اندر مثالیت موجود ہے۔ ان کا ہر کردار چند خصوصیات کا نمائندہ ہے اور اتنا پختہ نمائندہ کہ بالعموم کرداروں کے نام سے ان کی خصوصیات پہچانی جاسکتی ہیں۔

## ☆۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار:

پنڈت رتن ناتھ سرشار کی تصنیف ''فسانہ آزاد'' نے اپنی بعض کمزوریوں کے باوجود قصہ نگاری کی روایت کو ایک نئی جہت سے آشنا کیا یعنی ناول نگاری کا میلان ایک نئے افق کو چھونے لگا۔ ڈپٹی نذیر احمد نے دہلی کے متوسط طبقے کی زندگی کی تباہیوں اور پریشانیوں کو پیش نظر رکھا تھا۔ سرشار نے لکھنوی معاشرے کے ہر طبقہ کی زندگی کو سامنے رکھا۔ نذیر احمد کے مذہبی عقائد اور اخلاقی نظریات نے ان کی قوت مشاہدہ کو ایک طرح کی ''محدودیت'' میں مبتلا کر رکھا تھا۔ سرشار کے یہاں وعظ و نصیحت کے میلان پر مرقع نگاری مصوری ہندوستانی دیومالا کا شعور حاوی ہے۔ ان کی آزاد خیالی اور رندانہ بے نیازی نے لکھنوی معاشرے کے تمام طبقات کے احساسات کی ترجمانی کی۔ چونکہ ''فسانہ آزاد'' زمان ومکان کی سطح پر لکھنؤ سے ترکی تک کی زندگی اور معاشرت کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لیے اس کے پلاٹ میں اتحاد و ارتباط کا تصور کمزور اور خام رہ گیا ہے۔ اس کے واقعات میں ترتیب و تنظیم کے عدم شعور کی دوسری وجہ ہے کہ سرشار نے ''اودھ پنچ'' کے لیے اسے قسط وار تحریر کیا تھا۔ ہر ایک قسط میں معاشرے کے کسی نہ کسی اہم رخ کی تصویر پیش کی جاتی تھیں تاکہ ''اخبار بینوں'' کو دلچسپیاں برابر فراہم ہوتی رہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ''فسانۂ آزاد'' کے واقعات میں ابتداء وسط اور انجام کا تصور تلاش کرنا بے سود ہے۔ سرشار نے لکھنوی معاشرے کی زندہ جاوید تصویریں پیش کی ہیں جن کی روشنی میں آج بھی اس زمانے کے لکھنو کی تہذیبی، تمدنی اور معاشرتی زندگی کی تاریخ ترتیب دی جاسکتی ہے۔ ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل ''فسانہ آزاد'' کی چار جلدوں میں زوال آمادہ اودھ کے جاگیردارانہ عہد کی زندگی کے تمام گوشے منعکس ہوئے ہیں۔ ''آزاد'' اور ''خوجی'' اس کے وہ ناقابل فراموش کردار ہیں جن کے ذریعہ سرشار نے زندگی کی تمام تجرباتی وسعتوں ومشاہداتی

گہرائیوں اور خوشگوار حقیقتوں کو دیو مالاؤں کی مدد سے بے نقاب کیا ہے۔ ان کی سب سے اہم صفت یہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی کے ہزار ہا جلوؤں کو ''فسانۂ آزاد'' میں محفوظ کر دیا ہے۔

## ☆۔ عبدالحلیم شرر:

عبدالحلیم شرر نے صنفی طور پر ناول کے فن کو نئی بلندیوں سے روشناس کروایا۔ ان کی تخلیقات میں تعمیری مقاصد ہی کو فوقیت حاصل ہے لیکن انہوں نے نذیر احمد کی طرح بالکل کھلا ہوا واعظانہ اور ناصحانہ رنگ اختیار نہیں کیا پھر بھی ان کے یہاں ماضی کی روشن تاریخ اور روایات کے حوالے سے دیو مالائی عناصر کے برتاو کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ عبدالحلیم شرر نے معاشرتی اور تاریخی ہر دو نوعیت کے ناول لکھے ہیں۔ معاشرتی مزاج کے ناولوں میں'' دلچسپ'' حصہ اول (۱۸۸۵ء)'' دلچسپ'' حصہ دوم (۱۸۸۶ء)' ''دلکش'' (۱۸۸۷ء)'' بدرالنساء کی مصیبت'' (۱۹۸۱ء)'' آغا صادق کی شادی'' (۱۹۰۸ء) ''غیب دان دلہن'' (۱۹۱۱ء)''حسن کا ڈاکو'' (۱۹۱۲ء)'' اسرار دربار حرام پور'' (۱۹۱۳ء) اور ''خوف ناک محبت'' (۱۹۱۵ء) وغیرہ معروف ہیں۔ ان میں سماجی اور معاشرتی موضوعات سے ہم رشتہ مسائل کی پیش کش ہوتی ہے لیکن فنی بصیرت اور فکری گہرائی کی کمی نے ان ناولوں کو زیادہ با اثر نہیں بننے دیا۔

عبدالحلیم شرر کا پہلا تاریخی ناول ''ملک العزیز ورجنا'' (۱۸۸۸ء) ہے۔ تاریخی ناول نگاری کے شعور کو پروان چڑھاتے ہوئے انہوں نے مردہ رگوں میں حرکت و عمل کا گرم خون دوڑانے کے لیے اسلام کے کارناموں اور عہد رفتہ کی عظمتوں کی تصویریں پیش کیں اور صنف ناول کے لوازم کو شعوری طور پر برتنے کی کوشش کی۔ شرر کے دوسرے تاریخی ناول 'حسن انجلینا' (۱۸۸۹ء) 'منصور و موہنا' (۱۸۹۰ء) 'فلور افلورنڈا' (۱۸۹۹ء) 'فردوس بریں' (۱۸۹۹ء) 'ایام عرب' حصہ اول (۱۸۹۹ء) 'ایام عرب' حصہ دوم

(۱۹۰۰ء)'مقدس نازنین' 'شوقین ملکہ'(۱۹۰۵ء)'ماہ ملک'(۱۹۰۶ء)'قیس ولبنیٰ(۱۹۰۸ء)
یوسف نجمہ(۱۹۰۸ء)'فلپانہ'(۱۹۱۰ء)'زوال بغداد'(۱۹۱۲ء)'رومتہ الکبریٰ'(۱۹۱۲ء)
'فتح اندلس'(۱۹۱۵ء)'الفانسو'(۱۹۱۵ء)'بابک خرمی'(۱۹۱۶ء)'فاتح مفتوح'(۱۹۱۶ء)
'جویائے حق'(۱۹۱۷ء)'عزیزہ مصر(۱۹۱۹ء)'لعبت چین'(۱۹۱۹ء)'شہزادہ حبش'(۱۹۲۰ء)
'طاہرہ'(۱۹۲۳ء)'مینا بازار'(۱۹۲۵ء)اور'نیکی کا پھل'(۱۹۲۶ء) ہیں۔جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔کہ شرر پہلے قصہ نویس ہیں جنہوں نے ناول کو سمجھ بوجھ کر اردو میں اس کے لوازم کو برتنے کی کاوش کی۔فکر وفن کے اعتبار سے مجموعی طور پر شرر کا سب سے خوب صورت اور مکمل ناول ''فردوس بریں'' ہے جس سے اردو میں ڈرامائی ناول نگاری کی بنیادیں مستحکم ہوئیں۔

عبدالحلیم شرر کے ناولوں میں دیو مالائی عناصر کے برتاؤ کا اندازہ ان کے ایک ناول ''ایام عرب'' کے اس اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

> ''ایسا مقام اور ایسا دشت ہے جہاں اس وقت عرب کے وضیع وشریف'امیر وغریب'شاعر وادیب'اہل حرفہ اور سیاسی اور سب قسم کے آدمی آ کر جمع ہوتے ہیں۔شام وعدن کا ریشمی کپڑا یمن کی چادریں نجد کی کملیاں'عراق کا غلہ اور کم قیمت زیور اور انہیں کے ساتھ عربی خانہ بدوشوں کے بنائے ہوئے مشکیزے اور لکھپالیں اور ان کے بندھن پر سب چیزیں بک رہی ہیں.......اور ان بڑے بڑے سوداگروں کے درمیان میں قرب وجوار کی عورتیں بیٹھی ہوئی کھجوریں اور جو کے ستو بیچ رہی ہیں'' [۲]

## ☆۔ مرزا ہادی رسوا:

مرزا ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا''(۱۸۹۹ء)اردو ناول نگاری میں

سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے ۔مرزا ہادی رسوا کاافسانوی سفر''افشائے راز''(مطبوعہ۱۸۹۶ء) سے شروع ہوتا ہے ۔اس کے بعد انہوں نے ''ذات شریف''،''شریف زادہ''(۱۹۰۰ء)''اختری بیگم''اور''امراؤ جان ادا'' لکھےان میں سے بیشتر دوسرے درجہ کے ناول ہیں اور ان میں وہ فنی حسن نہیں ہے جو''امراؤ جان ادا'' کا امتیاری وصف ہے ناول کے فنی لوازم کو جس اہتمام اور کامیابی کے ساتھ مرزا رسوا نے ''امراؤ جان ادا''میں برتا ہےان کے کسی اور ناول میں اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ ان کے فکروفن کی مکمل نمائندگی دراصل''امراؤ جان ادا'' سے ہی ہوتی ہے جس میں فنی التزام کو کامیابی سے برتنے کا شعور ملتا ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد احسن فاروقی یہ اردو کا پہلا ناول ہے جس میں پلاٹ ملتا ہے یعنی نذیر احمد' سرشار اور شرر کے ناولوں کے مقابلہ میں''امراؤ جان ادا'' ہی پہلا ناول ہے جس میں پلاٹ کی تعمیر وتشکیل کا اہتمام کیا گیا ہے ۔اس کے پلاٹ میں باضابطگی اور خوب صورتی ہے۔ یہ منضبط اور مربوط ہے۔اس کے واقعات میں تناسب او رہم آہنگی ہے ۔وحدت اثر کی خصوصیت ہے' ساخت میں دلکش توازن ہے اور قصے کے اسلوب بیان میں شعریت۔''امراؤ جان ادا'' کی کردار نگاری بھی جاندار' متحرک اور تاثر آفرینی کی حامل ہے۔ پہلی مرتبہ رسوا نے نفسیاتی ژرف بینی سے کام لیا ہے۔ کرداروں کے داخلی کوائف' خارجی حالات سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔رسوا نے''امراؤ جان ادا''میں فرد اور سماج کے رابطوں کو فنی سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یوں تو''امراؤ جان ادا'' کا موضوع لکھنوی تہذیب ہے لیکن جو بات''امراؤ جان ادا'' کو اردو کے لازوال ناولوں میں کھڑا کرتی ہے وہ لکھنوی تہذیب کے دیو مالائی امتیازات کی عکاسی ہے دلوں کو خوش کرنے کے لیے رسوا نے حسن وعشق کے عناصر ضرور پیش کیے ہیں لیکن اپنے تہذیبی دیو مالائی شعور کو کہیں بھی مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔ بعض جگہ تو ایسا لگتا ہے کہ اب مصنف فحاشی وعریانی سے کام لے گا مگر وہاں بھی مصنف نے اپنے فن کو داغدار نہیں ہونے دیا ہے مثلاً'امراؤ جان ادا'' کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہوتی ہے

جس میں مردانہ شان اور ناز نخرے برداشت کرنے کا حوصلہ ہو۔ یہ تمام چیزیں اسے نواب سلطان میں نظر آتی ہیں یہاں بھی ناول کی دیو مالائیت ابھر کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ امراؤ جان، نواب سلطان کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ:

> ''گوہر مرزا بے شک میرا چاہنے والا موجود تھا۔ مگر اس کی چاہت اور قسم کی تھی۔ اس چاہت میں ایک بات کی کمی تھی جسے میرا دل ڈھونڈتا تھا۔ مردانہ ہمت کو اس کی طینت میں لگاؤ نہ تھا۔ ماں کا ڈومنی پن اس کے ضمیر میں داخل تھا۔ سلطان صاحب صورت و شکل کے اچھے تھے۔ ان کے چہرے پر اس قسم کا رعب تھا۔ جس پر عورت ہزار دل سے فریفتہ ہو جاتی تھی'' [۳]

غرض یہ کہ دیو مالا یا اساطیر کی جو مختلف صورتیں مختلف ماہرین نے بیان کی ہیں ان میں سے اکثر مرزا رسوا کے ناول ''امراؤ جان ادا'' میں نظر آتے ہیں۔

## ☆۔ پریم چند:

مرزا محمد ہادی رسوا کے بعد راشد الخیری اور مرزا محمد سعید وغیرہ کے ناولوں میں بھی کسی نہ کسی حد تک دیو مالائی عناصر کا سراغ ملتا ہے لیکن بیسویں صدی کے آغاز میں پریم چند اردو کے سب سے بڑے فکشن نگار کے طور پر سامنے آتے ہیں پریم چند کا پہلا ناول'' اسرار معابد''۱۹۰۳ء سے ۱۹۰۵ء تک قسط وار شائع ہوا لیکن اب کتابی شکل میں دستیاب ہے اس کے بعد پریم چند نے کئی شاہکار ناول لکھے مثلاً' ہم خرما و ہم ثواب''(۱۹۰۶ء)''جلوۂ ایثار''(۱۹۱۱ء)''بیوہ''(۱۹۱۲ء)''بازارِ حسن''(۱۹۱۸ء)''نرملا'' (۱۹۲۷ء) ''چو گان ہستی(۱۹۲۷ء)''گوشہ عافیت''(۱۹۲۹ء)''غبن''(۱۹۳۰ء) ''پردۂ مجاز''(۱۹۳۱ء)''میدان عمل''(۱۹۳۲ء)''گئودان''(۱۹۳۶ء)اور''منگل سوتر''(نامکمل)۔

پریم چند کے فن کی بلندی ان کے ناول ''گئودان'' میں نظر آتی ہے۔ جس میں ہندوستان کی سماجی اور معاشی نظام کے حوالے سے کرداروں اور واقعات کی تشکیل کی گئی ہے۔ ہندوستانی سماج میں طبقاتی تقسیم کی اہمیت بھی دیو مالائی حیثیت رکھتی ہے۔ پریم چند نے ناول کے مرکزی کردار ''ہوری'' اس کی بیوی ''دھنیا'' اور بیٹے ''گوبر'' کے حوالے سے زمیندار اور کسان امیر اور غریب کے بیچ کی دیو مالائی کھائی کی تصویر کشی کی ہے۔ پریم چند اس تقسیم کی مخالفت کرتے ہیں اور اس نظام کے خلاف احتجاج اور بغاوت کے جذبات کی حمایت بھی کرتے ہیں ۔جگہ جگہ ان کے ناول میں طنز کا پہلو نمایاں ہوتا ہے دراصل ہندوستان میں غریب اور محنت کش طبقہ کو دبا کر رکھنے کی روایت صدیوں سے چلی آرہی ہے۔ استحصالی قوتوں نے اس طبقہ کو ہمیشہ مسائل میں الجھا کر رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت بھی ہے اور زندہ دیو مالائی بھی۔ پریم چند نے اس مکروہ دیو مالا کو توڑنے کی کوشش کی ہے۔ ''گئودان'' میں اس کی ایک دلچسپ مثال ملتی ہے۔ ہولی کے موقع پر گاؤں کے نوجوان اپنا استحصال کرنے والے زمینداروں' ساہوکاروں کی نقل کرتے ہیں ایک منظر ہے جب ایک کسان ٹھاکر جھنگر سنگھ کی پیر پکڑ کر روتا ہے اور قرض مانگتا ہے ٹھاکر بڑی مشکلوں سے قرض دینے پر راضی ہوتا ہے۔ دس روپیہ کا کاغذ جب لکھ لیا جاتا ہے۔ ٹھاکر کسان کے ہاتھ میں پانچ روپیہ رکھتا ہے کسان پریشان ہو کر دکھ بھرے لہجے میں کہتا ہے:

''یہ تو پانچ ہی ہیں مالک؟

پانچ نہیں دس ہیں' گھر جا کر گننا۔

نہیں سرکار' پانچ ہیں

ایک روپیہ نذرانے کا ہوا یا نہیں؟

ہاں سرکار

ایک تحریر کا؟

ہاں سرکار

ایک کاغذ کا؟

ہاں سرکار

ایک دستوری کا؟

ہاں سرکار

ایک سود کا؟

ہاں سرکار

پانچ نقد۔ دس ہوئے کہ نہیں۔

ہاں سرکار۔ اب یہ پانچوں بھی میری
طرف سے رکھ لیجیے

کیسا پاگل ہے؟

نہیں سرکار۔ ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن
کا نذرانہ ہے۔ ایک روپیہ بڑی ٹھکرائن کا
ایک روپیہ چھوٹی ٹھکرائن کے پان کھانے
کا ہے ایک بڑی ٹھکرائن کے پان کھانے کا
باقی بچا ایک وہ آپ کے کریا کرم کے لیے'' ۲۴

دیو مالائی نقطۂ نظر سے بھی ''گئو دان'' کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ پریم چند کے زمانے کے گاؤں میں ''گئو دان'' کی ایک مستحکم دیو مالائی اہمیت تھی۔ سماجی و مذہبی اعتبار سے ''گئو'' اور ''دان'' ان دو لفظوں میں گاؤں والوں کی مذہبی عقیدت مندی اور سماجی اور ثقافتی قدروں کے سارے اسرار پوشیدہ تھے گائے کے دودھ سے گھر کے افراد پرورش پاتے ہیں اور اس کے گوبر سے گھر کو پاک کیا جاتا ہے۔ یہ دیو مالائی روایت آج بھی ہندوستان کے گاؤں میں موجود ہے۔ مذہبی اعتبار سے بھی گائے کی موجودگی لوگوں کو روحانی سکون بخشتی

ہے۔ پریم چند کے ناول کا مرکزی کردار گائے کی اس اہمیت کو سمجھتا ہے اور اس کی خواہش بھی یہی ہے کہ اس کے دروازے پر ایک گائے آجائے پریم چند نے ''ہوری'' کی اس عقیدت مندانہ تمنا کا اظہار ہوری کی زبان سے اس طرح کیا ہے:

''گئو سے تو درواجے کی سوبھا ہے۔ سیرے سیرے گئو کے درسن ہو جائیں تو کیا کہنا نہ جانے کب یہ سادھ پوری ہوگی، وہ سُبھ دن کب آئے گا'' ۵

اور جب ''ہوری'' کی یہ تمنا پوری ہو جاتی ہے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا:

''ہوری سچ مچ آپے میں نہ تھا۔ گائے اس کے لیے صرف بھگتی کی چیز نہ تھی بلکہ زندہ دولت تھی۔ وہ اس سے اپنے دروازے کی رونق اور گھر کی عظمت بڑھانا چاہتا ہے کہ لوگ گائے کو دروازے پر بندھی دیکھ کر پوچھیں کہ یہ کس کا گھر ہے؟ لوگ کہیں گے ہوری مہتو کا'' ۶

لیکن ''ہوری'' کا چھوٹا بھائی ''ہیرا'' اس کی خوشیوں کو دیکھ نہیں پاتا اور حاسدانہ جذبے کے تحت مذہبی تقدس کو بھی فراموش کرتے ہوئے گائے کو زہر دے دیتا ہے۔ گاؤں کے مکھیا ''ہوری'' پر ہی گئو بتیا کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ گاؤں میں اونچی ذات کے لوگ ہر طرح کے پاپ کرتے ہیں پھر بھی ان سے کوئی باز پرس نہیں کرتا جب کہ ''ہوری'' پر گئو بتیا کا پراشچت کرنے کے لیے سینکڑوں روپے کا جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔ جسے وہ مزدوری کر کے اور اپنا مکان رہن کر کے پورا کرتا ہے۔ اس موقع پر پریم چند مذہبی دیو مالاؤں یا اندھے عقائد پر طنز بھی کرتے ہیں پنڈت ماتا دین ہرکھو چمار کی لڑکی کو بطور رکھیل اپنے گھر رکھ لیتا ہے لیکن نہ تو اس پر کوئی اعتراض کرتا ہے اور نہ کوئی پنچائت اس سے باز پرس کرتی ہے بلکہ ماتا دین بڑی ڈھٹائی سے اپنے فعل کو جائز قرار دیتے ہوئے کہتا کہ یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ماتا دین نے:

''مہابھارت اور پرانوں سے ان برہمنوں کی ایک لمبی فہرست پیش کردی۔ جنہوں نے دوسری ذات کی لڑکیوں سے تعلق پیدا کرلیا تھا اور ساتھ ہی یہ ثابت کردیا کہ ان سے جو اولاد ہوئے وہ برہمن کہلائی اور آج کل کے جو برہمن ہیں وہ اسی کی اولاد ہیں۔ یہ رواج شروع ہی سے چلا آرہا ہے اور اس میں کوئی شرم کی بات نہیں'' ے

اس اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ پریم چند نے اپنے ناول ''گئودان'' میں ہند دیو مالائی عناصر کو برتا بھی ہے اور ان کے منفی پہلوؤں پر طنز بھی کیا ہے۔ اس اعتبار سے ''گئودان'' دیومالائی عناصر کے برتاؤ کے اعتبار سے بھی اردو کا ایک اہم ناول ہے۔

## ☆۔ قرۃ العین حیدر:

(پیدائش ۱۹۲۸ء وفات ۲۱ اگست ۲۰۰۷ء) پریم چند کے بعد اردو کی دوسری عظیم فکشن نگار ہیں۔ ان کے ناول مشترکہ تہذیب اور خصوصاً مسلم معاشرہ کے جاہ وجلال کے زوال کے نوحے ہیں مشترکہ تہذیب کے حوالے سے قرۃ العین حیدر نے کم وبیش اپنے تمام ناولوں میں دیو مالائی کرداروں واقعات مقامات اور رسومات کا جدید سماجی وثقافتی صورت حال کے پس منظر میں تجزیہ کیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا پہلا ناول (۱۹۴۹ء) ''میرے بھی صنم خانے'' کے نام سے شائع ہوا۔ یہ ناول تقسیم ملک فسادات اور صدیوں پرانی مشترکہ تہذیب کی شکست وریخت کے تناظر میں لکھا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر نے اپنے اس پہلے ناول میں ہی کس طرح ہندو و مسلم اتحاد کے حوالے سے مشترکہ تہذیب کی دیومالائی حیثیت کے زوال پر آنسو بہائے ہیں۔ اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے:

''تہذیب کے مرکزوں اور گہواروں میں پلنے والے دربدر کی

ٹھوکریں کھانے کے لیے صحراؤں کی طرف نکل گئے۔امام
باڑے ویران اور مسجدیں شکستہ ہوگئیں۔ پرانے خاندان مٹ
گئے۔زندگی کی پرانی قدریں خون او رنفرت کی آندھیوں کی
بھینٹ چڑھ گئیں۔ ایک عالم تہ و بالا ہوگیا۔ وہ تہذیب'
ہندوؤں اور مسلمانوں کا وہ معاشرتی اور تمدنی اتحاد' وہ روایات وہ
زمانہ سب کچھ ختم ہوگیا'' ۸

''میرے بھی صنم خانے'' کے بعد قرۃ العین حیدر نے تواتر کے ساتھ کئی ناول لکھے مثلاً ''سفینۂ غم دل'' (۱۹۵۲ء)،'' آگ کا دریا''(۱۹۵۹ء)،''آخر شب کے ہم سفر'' (۱۹۷۷ء)،'' کارِ جہاں دراز ہے''(۱۹۷۹ء)''گردش رنگ چمن''(۱۹۸۸ء)''چاندنی بیگم''(۱۹۹۰ء) ان کے علاوہ قرۃ العین حیدر نے کئی چھوٹے ناول یا ناولٹ بھی لکھے مثلاً ''سیتا ہرن''،'' چائے کے باغ''،''ہاؤسنگ سوسائٹی''،''دلربا'' اور'' اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجیو'' وغیرہ۔

ان ناولوں میں'' آگ کا دریا'' کو قرۃ العین حیدر کا ہی نہیں اردو ناول کی تاریخ کا سنگ میل تصور کیا جاتا ہے۔آٹھ سو صفحات پر مشتمل اس عظیم ناول میں مصنفہ نے متحدہ ہندوستان کی ڈھائی ہزار سالہ تہذیب کو اس کے تمام تر سماجی وتہذیبی و سیاسی نشیب وفراز کے ساتھ بڑے ہی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے۔اس ناول کا موضوع ہندوستانی تہذیب کی روح کی بازیافت ہے۔ چنانچہ اس ناول میں ہنداسلامی دیو مالا کی مختلف لہروں کو مختلف سیاق وسباق میں گرفت میں لینے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور ایسا ہونا بھی تھا اس لیے کہ ہندوستان کی ہزاروں پرانی تہذیب میں دیو مالاؤں کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے دیوی' دیوتاؤں اور ان کے روحانی وجسمانی معاملات وکمالات کے حوالے سے ایسی ہزاروں داستانیں حکایات تمثیلات اور مفروضات وابستہ ہیں جو دیو مالا کی اہم خصوصیات تصور کی جاتی ہیں۔ خاص طور پر ہندو دیو مالا میں جنس (Sex) اور دیگر جسمانی معاملات کو

جو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے ویدوں اور پرانوں میں رامائن اور مہابھارت میں مختلف دیویوں کی جو سراپا نگاری کی گئی ہے۔ ان میں جنسی لذت پرستی کا رجحان نمایاں ہے کرشن اور رادھا کی راس لیلاؤں کی تہہ میں بھی جنس کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے اور یہ سب ہندو دیو مالا میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

چوں کہ قرۃ العین حیدر کا بنیادی Concern متحدہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب ہے۔ اس لیے انہوں نے ''آگ کا دریا'' میں ایک طرف جہاں ہندو دیو مالا سے کسب فیض کیا ہے تو وہیں اسلامی اساطیر کو بھی بڑی خوبی سے برتا ہے اس کا اندازہ ''آگ کا دریا'' میں شامل درج ذیل اقتباس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''اگر محمدؐ اوتار جنم نہ لیتے
تو اللہ کی حکومت ترلوک میں قائم نہ ہوتی
نمو نمو ہے عبداللہ اور آمنہ
جے ہو۔ مکہ نگری اور ساری اولیاء کی اور بی بی
فاطمہ کی جو سارے جگ کی ماتا ہیں
جے ہو۔ اتر میں ہمالیہ کی جس کے قدموں
میں ساری کائنات پھیلی ہے
جے ہو۔ پورب سے نکلتے سوریہ کی
اب۔ میں برندابن کے سامنے جھکتا ہوں
بھگوان کرشن اور شری رادھے کو اور چاروں
ندیوں اور ساگروں کو میرا پرنام
اب میں آگے بڑھ کر سیتا دیوی اور ان کے
مہاراج رگھوناتھ کو میرا پرنام
جے ہو جے ہو جے ہو'' 9

## ☆۔ عزیز احمد:

ہندو دیو مالا میں عشق و محبت کے حوالے سے جنس (Sex) کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ وزیر آغا نے واضح لفظوں میں کہا ہے:

''دیو مالا کی لا تعداد کہانیوں کے پس پشت ایک ہی کہانی کی کڑیاں موجود ہیں یہ کہانی دراصل علامتوں کے روپ میں جنسی فعل ہی کو پیش کرتی ہے'' [10]

دکنی اردو شاعری پر ہندو دیو مالا کے زیر اثر جنسی لذت پرستی کے جور جحانات قلی قطب شاہ، علی عادل ثانی اور فضلی وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔ وہ لذت پرستی اردو نظم و نثر میں ایک مضبوط روایت کی شکل میں تصوف کے شانہ بشانہ آگے بڑھتی ہوئے دور حاضر کی شاعری اور نثر میں بھی نمایاں ہے۔ اگر چہ اب اس کی شکل بدل رہی ہے اردو ناول میں ہندو دیو مالا کے جنسی پہلوؤں کو سب سے زیادہ عزیز احمد نے اپنے ناولوں میں برتا ہے۔ عزیز احمد کے ابتدائی ناولوں ''ہوس''، ''مرمر اور خون'' وغیرہ میں جنسی لذت پسندی قابل اعتراض حد تک حاوی ہے جسے واضح طور پر فاشی اور عریانیت کی دلدل کہا گیا ہے لیکن عزیز احمد کا ناول ''گریز'' ایک کامیاب ناول مانا جاتا ہے۔ جو فنی اور تخلیقی اعتبار سے ایک مکمل شاہکار ہے لیکن اس ناول میں بھی اول تو ناول کے ہیرو ''نعیم'' کی جنسی اور اخلاقی گمراہیں ہضم نہیں ہوتی لیکن چوں کہ اس ناول میں عزیز احمد نے ہندوستانی منظر نامہ کو یورپ تک پھیلا کر پیش کیا ہے اس لیے اسے کامیاب ناول کہا جاتا ہے۔ پھر بھی اس ناول میں عزیز احمد کی جنس پرستی ناول کے کرداروں پر حاوی نظر آتی ہے۔ انہوں نے ادب میں جنسی مسئلہ سے متعلق اپنی کتاب ''ترقی پسند ادب'' میں یہ رائے دی تھی:

''جنسی مسئلوں اور پیچیدگیوں پر ادب میں ٹھنڈے دل سے غور کرنا اور ان پر بحث کرنا یا ان کا مطالعہ کرنا تو بے شک اس عہد

اور خصوصاً ہندوستان میں ایک بہت مفید اور اہم کام ہے لیکن
جنسی موضوع کے طلسم میں گرفتار رہنا جنس کو آرٹ یا ادب
کے لیے مقصود بالذات سمجھنا ترقی پسندی کی نہیں بلکہ انتہائی درجہ
کی تنزلی کی ہے'' [11]

## ☆۔ انتظار حسین:

اردو کے ایسے ناول نگار ہیں جن کے زیادہ تر ناول اور افسانے کسی نہ کسی شکل میں ہجرت، تقسیم ملک اور ان سے پیدا ہونے والی بحرانی صورت حال کا احاطہ کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے ابتدائی ناول ''دن اور داستان'' اور '' چاند گہن'' تجرباتی نوعیت کے تھے۔ ان ناولوں میں انتظار حسین نے کسی مخصوص تکنیک کو استعمال کرنے کی شعوری کوشش نہیں کی۔ یہ دونوں ناول یادوں کی بازیافت کرتے ہیں اور ان یادوں کے حوالے ہی سے کردار اور واقعات ناول کی سطح پر نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔ ان ناولوں کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تو اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ان ناولوں میں زندگی کا مربوط بیانیہ کھل کر سامنے نہیں آتا اور اہمیت اس تاثر کو دی گئی ہے جو یادوں کے حوالے سے مصنف کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ کہا جائے کہ ''دن اور داستان'' اور ''چاند گہن'' میں زندگی کو سورج کے اجالے میں لانے کے بجائے ٹمٹماتے چراغ کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ دونوں ناول ہمیں دھندلے اُجالے میں سفر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان دونوں ناولوں کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی۔

'' 'بستی' انتظار حسین کا پہلا مشہور ناول ہے اور یہ اس وقت منظر
عام پر آیا جب انتظار حسین اردو افسانے میں متعدد اقسام کے
تجربات کرنے کے بعد اظہار کے لیے نیا اور وسیع میدان تلاش
کر رہے تھے۔ اس وقت تک ان کے ذہن میں نہ صرف ہجرت

کا تجربہ مستحکم حیثیت اختیار کر چکا تھا بلکہ نئے ملک کے سماجی
تہذیبی اور سیاسی حالات نے ان پر ایک نیا جہان معنی بھی آشکار
کر دیا تھا' جو واضح طور پر دیو مالائی عناصر سے بھرا پڑا تھا۔ ان کا
ناول ''بستی''، ''ہجرت'' پر مبنی ناول ہے جو انتظار حسین نے
آزادی کے بعد اختیار کی۔ انہوں نے اپنے آبائی وطن
ہندوستان کو چھوڑ کر پاکستان کے شہر لاہور میں سکونیت اختیار
کی۔ اس ناول کا مرکزی کردار خاک ہے جو انتظار حسین کا
پروٹو ٹائپ نظر آتا ہے'' ۱۲

دراصل ''بستی'' میں بھی جنسی دیو مالائی فضا ملتی ہے۔ جس میں انتظار حسین نے اسلوب اور تکنیک کے بہترین تجربے کیے ہیں اور لگتا ہے اس کے لیے انہوں نے شعوری کوشش کی ہے۔

انتظار حسین کا دوسرا ناول ''تذکرہ'' (۱۹۸۷ء) بھی اس شگفتہ اسلوب کو قائم رکھتا ہے۔ یہ ناول بھی ناسٹلجیائی رجحان کا حامل ہے۔ اس لیے مصنف نے اس کے اسلوب میں انہیں عناصر کو برتا ہے جن سے ''بستی'' کی تشکیل ہوئی ہے۔ مگر اس میں جاتکوں اور ہندی دیو مالا کا عمل دخل بیانیہ اور مکالمے پر بالا دستی حاصل نہیں کرتا۔ اسلامی اساطیری اور تاریخی حوالے بھی موجود ہیں۔ لیکن ہیئتی فضا صاف ستھری ہے اور یہ احساس دلاتی ہے کہ مصنف نے پچھلے ناول کے مقابلے میں کہانی پن کے عنصر کو تجربے پر فوقیت دی ہے' ہندی' سنسکرت اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے انہوں نے اسلوب کو زیادہ شگفتہ بنانے کی شعوری کوشش کی ہے جو قاری کو بیک وقت ناول' داستان اور تذکرہ تینوں کے لطف سے ہمکنار کراتا ہے۔

اپنی تہذیبی جڑوں کی تلاش انتظار حسین کی فکشن نگاری کا بنیادی مسئلہ ہے اور یہ تلاش انہیں ہند اسلامی دیو مالاؤں کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں

انتظار حسین کا ایک نیا ناول ''آگے سمندر ہے'' منظر عام پر آیا۔ جس میں انہوں نے اپنے مخصوص موضوع ''ہجرت اور اپنی جڑوں سے اکھڑنے کے کرب'' کے ساتھ ساتھ مہاجرین کی ایک مخصوص (Agony) کو ظاہر کیا ہے۔ انتظار حسین نے اپنے ناول ''آگے سمندر ہے'' میں دیو مالائی عناصر کو کس طرح برتا ہے اس کا اندازہ درج ذیل اسطور سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''متھرا نگری کا حال مت پوچھ۔ وہ نگری رانڈ ہوگئی۔ جن کے دم سے اس کا سہاگ بنا ہوا تھا وہ اسے چھوڑ گئے۔ اب وہاں نہ موہن کی مرلی باجی ہے نہ پریم کی بانی گونجی ہے نہ گوپیوں کے دل دھڑکتے ہیں۔ گلیوں میں دھول اُڑتی ہے گوپیاں اداس ہیں۔ گیتا دُکھی ہوگئی ہیں'' ۱۳؎

## ☆۔ جوگندر پال:

ناول نگاروں میں جوگندر پال ایک منفرد حیثیت کے فن کار ہیں۔ انہوں نے اپنے تخلیقی تجربات کی ترسیل کے لیے ناول اور افسانہ کو وسیلہ اظہار بنایا ہے۔ اب تک ان کے متعدد افسانوی مجموعے اور کئی ناول سامنے آ چکے ہیں۔

جوگندر پال کے دو ناول ''خواب رو'' (۱۹۸۳ء) اور ''نادید'' (۱۹۹۱ء) اردو دنیا میں کافی مقبول ہوئے۔ یہ دونوں ناول مصنف کے نئے تجربات اور نئی واردات کے مظہر ہیں۔ جوگندر پال زندگی کے عام اور روزمرہ کے واقعات کو عام فہم لیکن دوررس نفسیاتی اور تہذیبی دیو مالائی عناصر کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ''خواب رو'' اپنے استعاراتی اور دیو مالائی برتاؤ، معنوی شدت اور حسن بیان کے تعلق سے ایک عجیب و غریب فن پارہ ہے۔ ہندو پاک تعلقات کی کہانی مدتوں سے کہی اور سنی جاتی رہی ہے۔ لیکن جوگندر پال نے اس کہانی کو جس دل سوزی گداز اور جس تعلق کے ساتھ لکھا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ انہوں

نے ہجرت کے مسئلے کو متحدہ ہندوستان کے دیو مالائی عناصر کے ساتھ دیکھا اور دکھایا ہے۔ انہوں نے دیوانے مرزا کمال الدین کو اپنے ماضی اپنے (Taboos) میں زندہ رہتے ہوئے ضرور دکھایا ہے لیکن ناول کا وژن یہ ہے کہ ہجرت کرنے والوں کو نئی سر زمین میں ہی اپنی محبت کا پودا لگانا چاہیے اور اپنی دیو مالاؤں کو نئے سانچوں میں ڈھالنا چاہیے۔

''خواب رو'' کا موضوع (ہجرت) جوگندر پال کا مرغوب ترین موضوع ہے جسے انہوں نے اکثر طویل و مختصر افسانوں میں برتا ہے۔ یہ موضوع دراصل ان کا اور ان کی معاصر نسلوں کا ایک اہم ترین مسئلہ ہے، ہجرت بالجبر ہو کہ بالرضاء آدمی جسمانی سطح پر ہی اپنی سرزمینوں سے علیٰحدہ نہیں ہو جاتا بلکہ اس کا پورا ذہنی اور تہذیبی وجود ہی علیٰحدگی کے عذاب سے دوچار ہو جاتا ہے۔ کہیں دوسرے اجنبی دیس میں اس کے لیے ایک نئی آب و ہوا، ایک نیا جائے وقوع مہیا کرتے ہیں اور یہ باطن ایک مسلسل تنہائی کے گہرے غار میں۔ اترتا چلا جاتا ہے اور کہیں اپنے ہی دیس میں اسے ایک بالجبر زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ اسے جب اپنی ہی قوم شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی ہے اس کی تہذیب اور اس کے عقائد کو جھٹلانے کے نت نئے بہانے تلاش کرتی ہے، روزگار کے دروازے اس پر بند کر دیئے جاتے ہیں اور محض ذلت، بھوک، خوف اور بے یقینی اور یکے بعد دیگرے ہجرت کے دکھ اس کی تقدیر کے دوسرے نام بن جاتے ہیں تب اسے اپنے پیروں تلے زمین کا بالشت بھر ٹکڑا بھی دھوکا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کسے اپنا وطن کہے کسے اپنا رفیق، کسے پنارہ رہنما، دراصل یہی وہ کرب ہوتا ہے جو کسی بھی زمین سے اکھڑے ہوئے انسان کو اپنی تہذیبی و ثقافتی و دیو مالائی جڑوں کی طرف رجوع کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ انتظار حسین کی طرح جوگندر پال نے بھی اس حقیقت کو بڑی سچائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

جوگندر پال کے اس ناول ''خواب رو'' میں خواب اور حقیقت یعنی دیو مالائی عناصر اور عصری حقائق ایک دوسرے میں اتنے گھل مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قیاس بھی مشکل ہے کہ خواب کہاں تک خواب ہے یا حقیقت ہے یا

کس حد تک حقیقت ہے۔ وہ بھی محض ایک خواب ہے' جوگندر پال نے دیوانے مولوی صاحب کے حوالے سے آئرنی (Irony) کے اس تضاد کو بڑی فنکارانہ چابک دستی کے ساتھ ابھارا ہے جو تلخ بلکہ انتہائی تلخ' ضرب کار اور حوصلہ شکن ہے۔

''دیوانے مولوی صاحب ان لاکھوں انسانوں میں سے محض ایک ہیں جنہوں نے ایک نئی مملکت کے خواب دیکھے' اس خواب کو اپنے ذہنوں میں مدتوں رچایا اور بسایا اور جب اس کی تعبیر ان کی تقدیر بنی تو وہ ہکا بکا رہ گئے یہاں اگر سحر شب برگزیدہ تھی تو اس کی وجوہ کچھ اور تھیں اجالے اگر داغ داغ تھے تو ان کے اسباب بھی قطعی مختلف تھے۔ آزادی برحق اور تقسیم وطن کا کفارہ ایک علیحدہ جبر۔ اس طرح کی صورت فوری سیاسی جبر کا نتیجہ تھی یا اس کے پس پشت کسی اور ہی کی دلربائی کام کر رہی تھی۔ ہمارے پرکھوں کی ناپختہ سیاسی فہم تھی یا بہر صورت تحصیل ہی ان کا مقصد تھا جسے کوئی بھی قیمت چکا کر حاصل کرتا ہے اور بس اسباب خواہ کچھ ہوں وطن عزیز کی تقسیم ایک زندہ حقیقت کے طور پر عمل میں آ کے رہی'' [۱۴]

مولوی صاحب کے علاوہ ہزاروں ہزار افراد ہیں جنہیں ہجرت کے اس شدید کرب سے دوچار ہونا پڑا ہے مگر خیر ہو زندہ یادداشتوں کی کہ ان کا حیدر آباد' ان کا دہلی' ان کا مرو ہڈ' ان کا الہ آباد اور ان کا لکھنؤ ان کی سانسوں میں رچ بس گیا ہے۔ وہی گلی کوچے' وہی دکانیں' وہی شور' وہی سکوت' وہی آداب' وہی انداز گویا ممکنوں کو قطع کرنے والے خطوط ذہن کی آبادوحدتوں کو ریزہ ریزہ نہیں کر سکے بقول جوگندر پال:

''لوگ آتے جاتے رہتے ہیں مگر مقامات ہمیشہ وہیں مقام کئے رہتے ہیں'' [۱۵]

اور یہیں سے دیو مالا کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ جوگندر پال نے دیو مالائی اسلوب اختیار کر کے ہندوستان اور پاکستان کے زمانی اور زمینی فاصلے مٹا دیئے ہیں۔ مگر حقیقت تو کچھ اور ہی ہے۔ مولوی صاحب اپنے خواب میں مست ہیں ان کی محبوب بیوی بیگم بھی ان کی دیوانگی سے پوری طرح واقف ہیں۔ مولوی صاحب کا پودا اب ایک ایسی سرزمین میں لگا یا دیا گیا ہے جہاں کی آب وہوا' جہاں کی مٹی کی خوشبو' جہاں کی نشو ونما کے آداب قطعی مختلف ہیں۔ اس منطقے میں نہ تو ان کی زبان کو سمجھنے اور برتنے والے نہ ان کی تہذیب اور نہ ان کے آداب زندگی کے قدرشناس ہیں۔ وہ تو وہاں کے قدیم باشندوں پر بس تھوپ دیئے گئے ہیں۔

جوگندر پال نے تمام صورت حال کا بشری نقطہ نظر سے جائزہ لیا ہے یہ نقطہ نظر ہی ان کے ناول کا پلاٹ ہے جس میں ظالم نہ تو ظالم ہے اور نہ مظلوم کوئی مظلوم' کیونکہ وہ جس صورت حال کے شکنجے میں پھنسے ہوئے ہیں وہی ان کی Destiny ہے جو آہستہ آہستہ ایک پورے اجتماع کو کسی نامعلوم Catastrophe کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے بلکہ اسے ایک وسیع تر Ironical Situation کہنا زیادہ درست ہوگا۔ جس میں ساری کی ساری خلقت دو مختلف دھڑوں میں بٹ گئی ہے اور دونوں دھڑے ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے غلط ایک دوسرے کے دشمن ایک دوسرے کے مقابل و متقابل ہے۔ جوگندر پال نے ایک نہایت ہی نازک ترین مسئلے کو اپنے ناول کا موضوع بنایا ہے۔

''خواب رو'' سے پہلے جوگندر پال کے دو اور ناولٹ ''آمد و رفت'' اور ''بیانات'' شائع ہو چکے ہیں۔ ''بیانات'' میں جوگندر پال نے حقیقی تصوراتی یا دیو مالائی زندگی کے مسئلے کو نفیس ڈرامائی کشمکش کے ساتھ فن کا موضوع بنایا ہے۔ عصری میکانکی سماج' صنعتی تہذیب اور مشینی ماحول میں حقیقی زندگی کا تصور افسانہ وافسوں بن کر رہ گیا ہے یہی وجہ ہے کہ انسان ماضی کے تصورات اور دیو مالائی مفروضات میں پناہ ڈھونڈتا ہے۔

''بیانات'' میں جوگندر پال نے عصر حاضر کی داخلی بے سروسامانی پر حسن کارانہ تنقید و تبصرہ کیا ہے عصر حاضر بحران و انتشار سے عبارت ہے۔ سائنس کو ضرورت سے زیادہ

اہمیت دینے کی بنا پر معروضیت و خارجیت اور نری حقیقت پسندی کو ہی سب کچھ سمجھ لیا گیا ہے اور داخلیت و انفرادیت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

''...... آج ایک طرف سائنس خارجی زندگی اور کائنات میں نئے نئے تجربات و انکشافات کر رہا ہے۔ دوسری طرف ادب انسان کی داخلی و باطنی کائنات میں نئے تجربات و انکشافات کی راہیں ہموار کر رہا ہے۔ اسی طرح ادب خارجی زندگی کے بے پایاں، لامحدود، متنوع اور گونا گوں سائنسی اور عقلی تجربات...... اور...... انسان کے باطنی اور داخلی تجربات کے درمیان مناسب و متوازن رشتہ و ہم آہنگی کی کوشش کر رہا ہے خارجی و داخلی زندگی کے اس عظیم فاصلے کو کم کرنا بھی ادیب ہی کا مقدر ٹھہرا'' [۱۲]

جوگندر پال کا ناول ''نادید'' بھی ایک اچھوتے موضوع پر لکھا گیا اہم ناول ہے۔ ''نادید'' کا مطالعہ اقبال کے اس شعر کو ذہن میں تازہ کرتا ہے۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبار جہاں
نگاہ شوق اگر ہو شریک بینائی

انسانی جسم پر آنکھ بصارت اور بصیرت کے لیے ہوتی ہے۔ آنکھ نہ ہو تو کائنات کے مظاہر معنیٰ اور ادراک سے خالی ہو کر رہ جائیں گے لیکن نابینا اپنے محسوسات و جذبات، تفکرات و تعلقات سے ماوراء بھی نہیں ہوتا۔

دراصل کائنات کی اشیاء اور مظاہر کے ساتھ ساتھ انسانی رشتے اور حالات و کیفیات بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جوگندر پال نے اپنے ناول ''نادید'' میں ایک جملہ لکھا ہے:

''سچ مچ آنکھ ہی سارے پاپ اور کشٹ کی جڑ ہے''۔ ☆☆

# حواشی

| | | |
|---|---|---|
| ۱۔ | بیسویں صدی میں اردو ناول | ڈاکٹر یوسف سرمست |
| ۲۔ | ادب اور زندگی | مجنوں گورکھپوری |
| ۳۔ | ایام عرب | عبدالحلیم شرر |
| ۴۔ | امراؤ جان ادا | مرزا ہادی رسوا |
| ۵۔ | امراؤ جان ادا | مرزا ہادی رسوا |
| ۶۔ | گئو دان | منشی پریم چند |
| ۷۔ | گئو دان | منشی پریم چند |
| ۸۔ | پریم چند کا تنقیدی مطالعہ | ڈاکٹر قمر رئیس |
| ۹۔ | پریم چند شخصیت اور کارنامے | ڈاکٹر قمر رئیس |
| ۱۰۔ | میرے بھی صنم خانے | قرۃ العین حیدر |
| ۱۱۔ | اردو شاعری کا مزاج | ڈاکٹر وزیر آغا |
| ۱۲۔ | آگ کا دریا | قرۃ العین حیدر |
| ۱۳۔ | آگ کا دریا | قرۃ العین حیدر |
| ۱۴۔ | چاندنی بیگم | قرۃ العین حیدر |
| ۱۵۔ | اردو ناول کے اسالیب | شہاب ظفر علی |
| ۱۶۔ | آگے سمندر ہے | انتظار حسین |

☆☆☆

☆۔ سال اشاعت ________ دسمبر ۲۰۱۳ء
☆۔ تعداد ________ ۵۰۰ (پانچ سو)
☆۔ کتابت و کمپیوٹر کمپوزنگ ____ شوکت احمد عباس
☆۔ سرورق ________ اختر رسول
☆۔ مطبع ---------------- کاف پرنٹرس حبہ کدل سرینگر
☆۔ قیمت ---------------- =/300 روپے

☆

**ملنے کا پتہ**

**شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی**

حضرت بل سرینگر کشمیر۔۱۹۰۰۰۶

فیکس: 01942426513

☆

**B A Z Y A F T**

**(ISSN 0975-654X)**

A Literary & Research Journal

Post-Graduate Department of Urdu
University of Kashmir, Srinagar-06
Fax: 01942426513 email:editorbazyaft@gmail.com
Website: http//urdu.uok.edu.in

**Price: Rs. 300/=**

تحقیقی و تنقیدی مجلّہ

2013ء

☆

ترتیب و تہذیب

منصور احمد منصور

☆

شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی، حضرت بل،

سرینگر کشمیر